

مولانا عبدالعزیز مبین

چند یادیں

عربی زبان کے مشہور محقق، ادیب اور النشا پیر داڑ مولانا عبدالعزیز مبین نے ۹۰ برس کی عمر میں ۲۷ اور ۲۸ اکتوبر ۱۹۷۸ء کی درمیانی شب کو کراچی میں انتقال کیا۔ بلا ریب کہا جاسکتا ہے کہ علامہ سیّد تقی بگلوی کے بعد اسلامی ہند نے اتنا بڑا عالم لغت اور ادب پیدا نہیں کیا۔ ان کی عظمت کا اعتراف عرب ممالک کے ادبا کو بھی تھا۔

مولانا مبین کا وطن مالوف راج کوٹ (کاٹھیاوار تھا) جہاں وہ ۱۸۸۸ء میں ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آبائی پیشہ زمینداری تھا۔ نو، دس برس کی عمر میں وہ تحصیل علم کی عرض سے دہلی چلے آئے۔ ان دنوں دہلی علوم اسلامیہ کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ شہر میں باکمال علما کے درس و تدریس کے حلقے بکثرت قائم تھے۔ مبین صاحب نے ابتدائی تعلیم مولانا عبدالرحمن پنجابی سے پائی جو ماسٹر طبیب (اب طبیبہ کالج) میں استاد تھے، اور درسیات کی تکمیل مولانا محمد بشیر سہسوانی سے کی؛ جو نواب صدر بیگ حسن خاں مرحوم کے زمانہ تدریس میں بھوپال میں قاضی رہ چکے تھے۔ ادب کی تعلیم کے لیے ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوئے جو عربی علم و ادب کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ انھوں نے سماء، منتبہ، مقامات اور سقط الزند ڈپٹی صاحب سے پڑھیں۔ مبین صاحب بیان کرتے تھے کہ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم ترجمہ اس قدر خوب صورت کرتے تھے کہ تالیف نہیں ہو سکتی۔ امیر حبیب اللہ خان دلی افغانستان ایک دفعہ دہلی تشریف لائے تو ڈپٹی صاحب امیر حبیب اللہ خان سے ملنے گئے۔ اتفاق سے عید کا دن تھا۔ ڈپٹی صاحب نے منتبہ کا عید اور درجہ حبیب والا شعر پڑھا۔ عید کے دن اور امیر صاحب کے نام کی مناسبت نے عجیب سماں پیدا کر دیا اور امیر صاحب بہت محفوظ ہوئے۔ اس زمانے میں حقول کا بڑا شہرہ تھا۔ قدیم فلسفہ اور منطق کی کتابیں پڑھے بغیر کوئی شخص صحیح معنوں میں عالم کہلانے کا مستحق نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ان علوم کا سب سے بڑا مرکز مدرسہ عالیہ رام پور تھا۔ علامہ محمد طیب مکی صدر مدرس تھے، جو بلند پایہ ادیب تھے۔ ان کی علمی شہرت کی وجہ سے نہ صرف ہندوستان

بلکہ افغانستان اور پاکستان تک کے طلباء رام پور کھینچے چلے آتے تھے۔ مہمن صاحب نے رام پور جاکر علامہ طیب صاحب سے استفادہ کیا اور فراغت کے بعد دہلی چلے آئے، جہاں رہ کر پنجاب یونیورسٹی کے مشرقی امتحانات منشی فاضل اور مولوی فاضل ۱۹۰۸ء اور ۱۹۰۹ء میں پرائیویٹ طور پر پاس کیے اور یونیورسٹی میں اڈل آئے۔

اس وقت شہر دہلی مجمع الکمال بنا ہوا تھا۔ بڑے بڑے علما، ادا اور صلحا وہاں موجود تھے، لیکن مولانا مہمن افسوس سے ذکر کیا کرتے تھے کہ دہلی احناف اور اہل حدیث علما کے فقہی اختلافات کا اکھاڑہ بنی ہوئی تھی۔ فریقین میں مناظرے ہوا کرتے تھے اور یہ مناظرے بسا اوقات مجادلے اور مقلاتے بن جایا کرتے تھے۔ وہ بیان کرتے تھے کہ مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کو انتقال کیے ہوئے تقریباً نصف صدی کا زمانہ گزر چکا تھا، لیکن لوگوں کے دلوں میں بہادر شاہ کی یاد تازہ تھی۔ اس کی یہ غول:

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے

بچے بچے کی زبان پر تھی۔ دہلی کا غوثی دروازہ، جہاں منگل شہزادوں کو سولی دی گئی تھی، زیارت گاہ عوام و خاص تھا۔ ارزانی کا یہ عالم تھا کہ مصر کی چھپی ہوئی صحیح بخاری اڑھائی تین روپے میں مل جاتی تھی۔

اسی اثنا میں ان کو ایڈورڈ مشن کالج پشاور میں عربی و فارسی کے ٹیچر کی جگہ مل گئی اور وہ پشاور چلے آئے۔ اس زمانے میں انھوں نے لاہور کے مشہور ادبی رسالہ مخزن میں عربی کے نصاب تعلیم کی اصلاح پر رمضان لکھے، جن میں کافیہ اور شرح ملا جامی کے بجائے ابن ہشام کی کتابوں (شرح قطر الندی اور شرح شذوذ الذہب) اور الفیہ کی شروح کو اختیار کرنے اور منطق و فلسفہ کے بجائے علم حدیث کے اشتغال اور مزاہدیت پر زور دیا گیا تھا۔

اپریل ۱۹۲۱ء میں وہ مولوی محمد شفیع کی قدر دانی سے اورینٹل کالج لاہور میں ایڈیشنل مولوی کی حیثیت سے تشریف لے آئے۔ یہ زمانہ اورینٹل کالج کے شباب کا زمانہ تھا۔ شعبہ عربی میں مولوی محمد شفیع کے علاوہ مولوی نجم الدین اور مولانا سید محمد طلحہ (سید ابوالحسن علی ندوی کے پھوپھا) بھی تھے، جب کہ شعبہ فارسی میں ڈاکٹر شیخ محمد اقبال (مترجم ایران بعد ساسانیان) اور سید وجاہت حسین بگلرامی (رام پوری) تدریسی خدمات انجام دیتے تھے۔ ان اساتذہ کے علم و فضل اور تدریسی ہمارت کی شہرت سن کر یوپی، بہار، ریاست ہائے راجپوتانہ بلکہ حیدرآباد (دکن) تک سے بھی طلباء لاہور کا رخ کرتے تھے۔ مولانا مہمن کالج میں عربی تدریس کے علاوہ اورینٹل کالج کے ہوسٹل کے بھی نگاہیں تھیں، جو صرف ہمارے غرض سے تھا۔ اس کے شاگردوں میں مولوی امتیاز علی عرش

رام پوری، ڈاکٹر شیخ غنایات اللہ مرحوم اور ڈاکٹر سید عبداللہ قابل ذکر ہیں۔ سید عبداللہ صاحب بیان کرتے ہیں کہ مولانا مبین سب سے متعلقہ اس مہارت اور سعی سے پڑھاتے تھے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ لاہور کے زمانہ قیام میں انھوں نے مولوی محمد شفیع مرحوم کی تبلیغ اور شوق سے خزانہ الادب (عبد القادر بغدادی) کا انگلش اکیڈمی الخزانہ کے نام سے شائع کیا۔ مشہور عرب شاعر ابوالعلاء المعری کے حالات اور فلسفہ شاعری میں ابوالعلاء المعری و مالہ کے نام سے ایک کتاب لکھی جو دار المصنفین کی طرف سے قاہرہ سے چھپ کر شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ انھوں نے ابن رشیق کے حالات لکھے اور اس کے اشعار کا مجموعہ مختلف ادبی کتابوں کو لنگھال کر شائع کر دیا۔ اور سینٹل کالج میمورین کا اجرا ہوا تو مولوی محمد شفیع صاحب نے مبین صاحب کو بھی اردو میں لکھنے کی ترغیب دی اور ان کی ہر طرح سے علمی رہنمائی کی۔ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ مبین صاحب میں علمی لگن اور ذوق تحقیق و جستجو مولوی محمد شفیع مرحوم ہی نے پیدا کیا۔ حیرت ہے کہ مبین صاحب نے شفیع صاحب کے احسانات کا کبھی بھی اعتراف نہیں کیا۔

اکتوبر ۱۹۲۵ء میں مسلم یونیورسٹی میں عربی کے ریڈر کی آسامی خالی ہوئی تو مبین صاحب غالباً علامہ اقبال مرحوم کی سعی و سفارش سے علی گڑھ چلے گئے اور ۱۹۵۰ء میں صدر شعبہ عربی کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔ ان کی آمد سے قبل عربی شعبے کا صدر جرنیل یا برطانوی مستشرق ہو کر رہا تھا، جس کی وجہ سے یہ شعبہ خاطر خواہ ترقی نہیں کر سکا تھا۔ معیار تعلیم کی پستی کا یہ عالم تھا کہ ایم، اے (عربی) کے کورس میں بائبل کا عربی ترجمہ شامل تھا۔ مبین صاحب نے نصاب تعلیم کی اصلاح کی، عربی ادب کی اصناف کتب، مثلاً الکامل (المبرد) اور کتاب العربیہ (ابن رشیق) نصاب میں داخل کیں، شعبہ عربی کا وقار ہندوستان اور یہ دونے ہندوستان میں قائم کیا اور طلباء صحیح علمی ذوق اور ملکہ تحقیق پیدا کیا۔ ان کے درس و تدریس سے بہت سے مستعد طلباء نے فائدہ اٹھایا، جن میں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ (حیدر آباد سندھ، اب اسلام آباد)، ڈاکٹر سید محمد یوسف مرحوم (کراچی یونیورسٹی)، ڈاکٹر مختار الدین آزاد (مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) اور ڈاکٹر محمد شید احمد فاروق (دہلی یونیورسٹی) قابل ذکر ہیں۔ افسوس ہے کہ ڈاکٹر محمد یوسف نے جن کو مبین صاحب بھی بہت مانتے تھے، ٹریفک کے حادثے میں گزشتہ ستمبر میں لندن میں انتقال کیا۔

علی گڑھ کے قیام کے دوران میں ان کا قابل ذکر کا نامہ امالی القالی کی شرح کی اشاعت ہے۔ اس کی شرح ایک انڈی عالم البوعید البکری نے الالائی کے نام سے پانچویں صدی ہجری میں لکھی تھی جو نایاب تھی مبین صاحب نے

اس کے متعدد نسخے بہم پہنچائے، ان کے مقابلے اور تصحیح سے ایک صحیح نسخہ مرتب کیا، اس پر حواشی لکھے، شائع کی غلطیوں اور غور گزارا شدہ کی نشاندہی کی اور ۱۹۳۵ء میں خود قاہرہ جاکر اس کو سمط الملائکی کے نام سے شائع کرایا۔ علمی حلقوں میں اس کتاب کی خوب پذیرائی ہوئی جو آئندہ چل کر عالم عرب میں ان کی شہرت اور تعارف کا ذریعہ بنی۔ اہم بعد القاسم الجرجانی نے ابوتام، بحتری اور متنبی کے دو ادین کا انتخاب الطرائف اللادبیہ کے نام سے کیا تھا۔ یہ بھی اسی زمانے میں یمن صاحب کے حواشی اور ضروری تشریحات کے ساتھ شائع ہوا۔ الفتح کے فاضل مدیر محب الدین الخطیب کی فرمائش پر خزانۃ الادب (عبد القادر بغدادی) کی جدید اشاعت میں حصہ لیا۔ اس کی صرف چار جلدیں شائع ہو سکیں۔ یہ کتاب دیکھنے کو تو شیخ رضی السمرکندی کی شرح کافیہ کے شواہد کی شرح ہے، لیکن حقیقت میں عربی ادب کا خزانہ ہے، جس سے کوئی ادیب مستغنی نہیں ہو سکتا۔ اب اس کو مھر کے مشہور محقق عالم استاذ عبد السلام محمد ہارون جدید تحقیق، تصحیح اور تہذیب کے جملہ لوازم کے ساتھ شائع کر رہے ہیں اور اس کی چھ سات جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور بقیہ زیر طباعت ہیں۔ یمن صاحب نے مصری حکومت کے اصرار پر لسان العرب کی بھی تصحیح کی، لیکن اس کی صرف ایک جلد شائع ہو سکی۔ اس کاوش میں مسٹر کریکلو بھی ان کے شریک کار تھے۔

۱۹۵۵ء میں وہ کراچی یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے صدر بن کر پاکستان چلے آئے۔ اس دور کا علمی کارنامہ دیوان حمید بن ثور الملالی اور الفاضل المبروم کی اشاعت ہے۔

دسمبر ۱۹۵۶ء میں راقم السطور کو ان کی زیارت اور ملاقات کا پہلی دفعہ شرف حاصل ہوا۔ اسلامی کلوکیم (مذکرہ) لاہور میں بہت سے مستشرقین اور عرب کے متعدد فضلا مدعو تھے، جن میں نمایاں شخصیت شام کے مشہور سلفی عالم شیخ محمد سبحت میطار کی تھی۔ اس سے قبل میں ان کے علمی مقالات اور نئی کتابوں پر متوازن تبصرے

لے افسوس ہے کہ بیٹا صاحب نے گذشتہ برس دمشق میں انتقال کیا۔ وہ عالم متبحر، زندہ دل اور باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ عمر بھر شام کی علمی مجلس مجمع علمی العربی کے نائب صدر رہے۔ وہ پاکستان کے سچے ہی خواہ اور ہمدرد تھے۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں انھوں نے دمشق میں پاکستان کی حمایت میں ایک جلوس کی قیادت بھی کی تھی۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنی رحمت و مغفرت سے نوازے۔

مجمع العلمی العربی (مشق) کے سہ ماہی مجلہ میں پڑھ چکا تھا اور ان سے غائبانہ عقیدت رکھتا تھا، چنانچہ میں استاد محترم شیخ محمد العربی المراكشي کی معیت میں فلیڈی ہوٹل پہنچا جہاں عرب مندوبین موجود تھے۔ معلوم ہوا کہ شیخ محمد بھت بیطار مولانا محمد اولیس کاندھلوی (شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ) کے ہاں چلے گئے ہیں۔ ان کی تلاش میں ایک اور صاحب بھی سرگرداں تھے، لمبا قد، چھریلا بدن، خشخشی داڑھی، اور ترکی ٹوپی، اپکن اور پاجامے میں ملبوس۔ مراکشی صاحب نے بتایا کہ یہی مولانا عبدالعزیز مبین ہیں۔ ہم سب مل کر مولانا محمد اولیس کاندھلوی کے فضیلت کدے پر پہنچے، جہاں بیطار صاحب بلب ہزار داستان بنے شیعوں کے متعلق لطائف و ظرائف بیان کر رہے تھے اور ساری مغل کو کشت زعفران بنا رکھا تھا۔ ان کے ساتھ شام کے مشہور عالم استاد محمد المبارک بھی تھے۔ مبین صاحب کی آمد پر علمی مسائل چھڑ گئے جس میں میرے اندازے میں مبین صاحب کا پلہ بھاری رہا۔ دوسرے روز سب مندوبین مدرسۃ البنات میں مدعو تھے۔ مدرسہ والوں کی خیر مقدمی تقریر کے بعد شیخ بھت بیطار جوابی تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو پاکستان کے حوالے سے کشمیر کا ذکر کر دیا۔ اس پر حیدر آباد دکن کے مندوب مسٹر امیر علی بھٹک اٹھے اور کہا کہ اس تقریب کا سیاسی مسائل سے کیا تعلق؟ اس وقت بیطار صاحب نے جس دینی غیرت و حمیت کا ثبوت دیا، انس کی یاد آج بھی صہرت انگیز ہے۔ وہ جوش میں اہر کہنے لگے کہ میں ایک دفعہ نہیں سو دفعہ کہوں گا بلکہ ہزار بار کہوں گا کہ کشمیر پاکستان کا ہے اور پاکستان کو ملنا چاہیے۔ ڈاکٹر عبدالوہاب عزام مرحوم نے بیطار صاحب کو ایک طرف لے جا کر یہ مشکل چپ کر لیا۔ بیس کیس برس گزرنے کے باوجود اس محفل کی یاد شرکاکے دلوں میں ابھی تک تازہ ہے۔

۱۹۶۰ء میں سنٹرل انٹیلیجنٹ آف اسلامک ریسرچ (ادارہ تحقیقات اسلامی) قائم ہوا، تو مبین صاحب اس سے متعلق ہو گئے۔ اس وقت سب سے مشکل کام کتب خانہ کی فراہمی تھا۔ اس کے لیے انھوں نے عراق، شام، مصر، ترکی اور تونس کا سفر کیا اور ضروری کتابیں خرید کر لائے۔ ۱۹۶۴ء میں وہ جناب ممتاز حسن کی تحریک اور پروفیسر حمید احمد خان مرحوم (سابق وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی) کی قدر دانی اور معاونت پر

علہ غائبیہ امیر علی وہی ہیں، جنھوں نے قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ ان کی عربی زبان سے ناواقفیت اور مشتعل مزاج کی شکایت مصر کی مشہور ادیبہ عائشہ عبدالرحمان (بنت الشاطی) نے بھی کی ہے۔ اس کے لیے ان کی کتاب تراشا (مطبوعہ دار المعارف، قاہرہ) ملاحظہ ہو۔

کی یہ دولت عربی زبان کے صدر شعیب بن کر اور سنٹل کالج میں تشریف لے آئے اور لاہور میں دوساں مقیم ہیں۔ افسوس ہے کہ اس مرتبہ ان سے خاطر خواہ استفادہ نہ ہو سکا۔ اب وہ پیرانہ سال کی وجہ سے درس و تدریس کے بجائے علمی و تحقیقی کاموں میں رہنمائی کے لیے زیادہ سودمند ہو سکتے تھے۔

مولانا میمن کا معمول تھا کہ وہ ہر اتوار کو مولانا عبیدالحق خان ندوی کے مکتبہ العلمیہ میں آتے تھے۔ عربی زبان و ادب سے شغف رکھنے والے اصحاب بھی ان سے ملنے و ہمیں چلے آتے تھے۔ راقم بھی بالاتزام ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا۔ یہ پُر لطف نشست دو ڈھائی گھنٹے جاری رہتی جو علمائے سلف ان کی نادر تصانیف، نواب صدیق حسن خان کی علمی خدمات اور ہندوستانی محدثین کے کارناموں کے ذکر سے معمور رہتی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ گزشتہ صدی کے آخر میں مولانا امجد علی شہید اور مشائخ دیوبند کے خلاف الزام تراشی اور سب و شتم کی جو تحریک اٹھی تھی، اس کے پس پردہ انگریز کا ہاتھ تھا۔ وہ یہ بھی بتلاتے تھے کہ لاہور یونیورسٹی کے جانے کے بعد جو خفیہ کاغذات ایوانِ حکومت (ذیلی) سے برآمد ہوئے تھے، ان میں اس تحریک کے متجربوں کو حکومت برطانیہ کے بہت بڑے خیر خواہ اور مہر در بتلایا گیا ہے۔ ان کی گفتگو کا دلچسپ موضوع نادر علمی کتابیں تھیں جن کی تلاش اور جستجو میں انھوں نے دمشق، قاہرہ، قسطنطنیہ اور رباط کے کتب خانے چھان مارے تھے۔ قسطنطنیہ کے علمی خزائن، عجائب گھر اور سلطانِ آل عثمان کے تاریخی آثار، وہ دلکش موضوع تھا جس پر وہ حاضرینِ مجلس کو گھنٹوں تک اپنی پُر لطف گفتگو سے لطف اندوز کرتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ انھوں نے سلطانِ ٹیپو کی سفارت کا حال سنایا جو سلطان نے خلیفۃ المسلمین کی خدمت میں درود اعانت کے لیے قسطنطنیہ بھیجی تھی۔ اس سفارت کو زیادہ پذیرائی حاصل نہ ہو سکی اور اس کے ارکان قسطنطنیہ ہی میں مہکپ گئے۔ میمن صاحب بتلاتے تھے کہ ان کا قبرستان آج بھی وہاں موجود ہے۔ اس مجلس میں وہ کبھی دلی اور کفن و مزاح کی باتیں بھی کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ایک علمی آدمی کے لیے تھوڑا سا خود فراموش ہونا بھی ضروری ہے۔

عالمِ عرب کے بیشتر فضلا سے ان کے گہرے اور ذاتی تعلقات تھے اور وہ ان کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ عربوں میں وہ شامیوں کی جہان نوازی، نرم خوئی اور خوش اخلاقی کے بڑے معترف تھے۔ اسی طرح وہ اہل تونس کی تمذیب و شائستگی کے بڑے مداح تھے اور بتلاتے تھے کہ بیشتر تونسوی ان مہاجروں کی اولاد ہیں جو اندلس کو تھیں باد کہہ کر شمالی افریقہ میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ وہ جامعہ ندویہ کے شیخ الجامعہ طاہر بن عاشور کی بھی

تعاریف کیا کرتے تھے، جو بڑھاپے میں بھی نواب صدیق حسن کی طرح خوب صورت اور دیدہ زیب دکھائی دیتے تھے۔ شیخ غاہر بن عاشور نے قرآن مجید کی تفسیر التحریر والتیسیر فی التفسیر کے نام سے لکھی ہے اور اس میں اعجاز القرآن سے خاص طور پر اعتنا کیا ہے۔ وہ عرب قوم پرستی کو جس کا مقصد عربوں کو غیر عرب مسلمانوں سے دور رکھنا ہے، خود عربوں کے حق میں مضرت سمجھتے تھے۔ وہ ترکوں کی علمی سہ پرستی کے بے حد مداح تھے، جن کی علمی سرگرمیوں کی بدولت اسلاف کے علمی خزانے تباہ ہونے سے بچ گئے۔ لاہور سے سبکدوش ہو کر وہ کراچی چلے گئے اور وہاں خاموش زندگی گزارنے لگے۔ اس کے بعد بھی وہ ایک یا دو بار لاہور تشریف لائے اور ان سے نیا نیا حاصل ہوتا رہا۔ اس زمانے میں انھوں نے البوتمام کے دیوان الحماۃ الصغریٰ اور علی حمزہ بصری کی التبیہات علی اغالیط الرواۃ شائع کیں۔ مجلہ مجمع اللغة العربی (سابقہ مجمع علمی العربی) دمشق میں انھوں نے معجم اللادبا یا قوت پر نقد و تبصرہ لکھا جو کئی قسطوں میں شائع ہوتا رہا۔ وہ امام ضعی الدین صغانی کی الصیاب الزاخری کی اشاعت کی بڑی آرزو رکھتے تھے، چنانچہ اسی مسئلے میں انھوں نے اس کا مقدمہ بھی شائع کیا تھا۔ کراچی میں جناب ممتاز حسن مرحوم (سابقہ معتمد مالیات حکومت پاکستان) اور پیر حسام الدین راشدی ان کے بڑے مداح اور عقیدت مند تھے اور یمن صاحب کی ان کے ہاں آمد و رفت رہا کرتی تھی۔ علمی حلقوں میں ان تینوں کی بذلہ سخی، لطیفہ گوئی اور باہمی طنز و مزاح مشہور تھی۔ ممتاز حسن مرحوم کی تحریک سے انھوں نے اردو بورڈ کے زیر اہتمام عربی لغت اور اس کی خصوصیات پر کئی خطبات دیے تھے، جو اردو بورڈ کے سہ ماہی مجلے میں کئی قسطوں میں شائع ہوئے تھے۔ اب ضرورت ہے کہ پیر حسام الدین راشدی ان خطبوں کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا اہتمام فرمائیں۔ یمن صاحب چند برس سے تنہائی کی زندگی بسر کر رہے تھے، اہلیہ کا انتقال ہو چکا تھا اور لڑکے ملازمت کے سلسلے میں کہیں باہر مقیم تھے۔ ہمیشہ کے علاوہ ایک پوتا ان کی خبر گیری کیا کرتا تھا۔ آخری عمر میں نہایت لاغر اور کمزور ہو گئے تھے، لیکن حافظہ برابر اپنا کام کرتا رہا اور کتابیں ان کی مونس و مہمد بنی رہیں۔ انھوں نے نوٹس بین کی عمر میں، جو طویل تعلیمی اور علمی خدمات سے معمور تھی، ۲۷ اور ۲۸ اکتوبر ۱۹۷۷ء کی درمیانی شب کو اپنی ہمیشہ کے ہاں انتقال کیا۔

مولانا عبد العزیز یمن یادداشت میں علامتے سلف کا نمونہ تھے۔ سیکڑوں عربی قصائد اور ہزاروں اشعار نوک زبان تھے۔ کتب درسیں، دیوان المتنبی اور دیوان الحماۃ تقریباً مکمل حفظ تھے، مفضلیات، الکامل (المبدی)

اور کتاب البیان والتبیین (جاہظ) کے بیشتر حصے ازبر تھے۔ وہ عرب ممالک میں ابوالعلا المعمری پر اتھارٹی (سند) سمجھے جاتے تھے۔ نادر علمی کتابوں کی اشاعت اور انتخاب میں ان سے مشورہ ناگزیر تھا۔ وہ مجمع اللغۃ دمشق اور قاہرہ کے بھی رکن تھے۔ میمن صاحب مسلک اہل حدیث تھے، لیکن نہایت فراخ دل تھے اور جمود سے پاک۔! سیر و سیاحت اور مختلف انخیال اصحاب فکر و نظر کی میل ملاقات نے ان کو وسیع النظر بنا دیا تھا۔ وہ امام شافعی کے بے حد عقیدت مند اور مداح تھے اور اصول فقہ میں ان کے الرسائل کی عربیت کی بڑی تعریف کرتے تھے۔ کما کرتے تھے کہ جتنے علمی و ادبی آخذ و مصادر بعد القادر بغدادی (مصنف خزائن الادب) کی دسترس میں تھے، وہ آج تک کسی عالم یا ادیب کو حاصل نہیں ہو سکے۔ مستشرقین میں وہ مسٹر سالم کریسکو (KRENKOW) جو ان کے ساتھ علی گڑھ میں کام کر چکے تھے، کی وسعت معلومات اور ژرف نگاہی کے ثنائون تھے۔

مولانا مبین درس نظامی کے نصاب تعلیم میں اصلاح و ترمیم کی ضرورت شدت سے محسوس کرتے تھے۔ نحو میں کافیہ اور شرح ماجامی جیسی کتابوں کے بجائے الفیہ کی بعض شروح اور ابن ہشام کی کتابیں پسند کرتے تھے۔ وہ بتلاتے تھے کہ کافیہ اور اس کی شروح وغیرہ عرب ممالک میں کہیں بھی نہیں پڑھائی جاتیں، جب کہ صدیوں سے ہمارے ہندوستانی علما کی ذہنی توانائیاں کافیہ وغیرہ کی عقدہ کشائیوں میں صرف مہرہی ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے لیے امام نووی کی ریاض الصالحین کی سفارش کرتے تھے جس میں نور نبوت کے علاوہ ادبی چٹائی بھی پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ سنن ابی داؤد کی کتاب الادعیہ اور ترمذی کی کتاب الزہد و الرقاق کے مطالعہ کی بھی تاکید کیا کرتے تھے۔ تفسیر میں جلالین کے بجائے جامع البیان کی افادیت کے قائل تھے۔ ابن خلدون نے جن کتابوں کو اصول فن ارب قرار دیا ہے، ان کے متعلق انھوں نے الذودہ (دور جدید) میں میری محسن کتابوں کے عنوان کے تحت بڑا دلچسپ تبصرہ لکھا تھا۔ ان کی یہ رائے تھی کہ الکامل (المبرد) ایک مبتدی کے لیے زیادہ مفید ہے، ادب الکاتب کو اقتضار کے ساتھ پڑھا جائے تو انسان کو ایک محقق لغوی بنا سکتی ہے۔ کتاب البیان و التبیین (جاہظ) میں فصیح نظم و نثر کے نمونے ان چاروں سے زیادہ ہیں، اور نوازلت و شعر امالی الثانی میں سب سے زیادہ ہیں۔ ان کے نزدیک سما سیات میں البوتمام کا دیوان الحماسہ سب سے بہتر ہے اور نقد الشعر کے لیے ابن رشیق کی کتاب العمدہ بہترین کتاب ہے۔ کما کرتے تھے کہ الغریب المصنعت (ابن سلام) اور اصلاح المنطق (ابن السکیت) وہ کتابیں ہیں، جن کا یاد ہونا ایک ادیب

کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اول الذکر شاید ابھی تک شائع نہیں ہو سکی جب کہ مؤخر الذکر کتاب استاذ عبدالسلام محمد ہارون کی علمی کاوش سے بڑی آب و تاب سے شائع ہو چکی ہے۔

اس علم و فضل کے باوجود ان میں غرور و تمکنت نام کو نہ تھا۔ ان کی طرز معاشرت سادہ اور درویشانہ تھی۔ وہ سودا سلف خود بازار سے خرید کر لاتے تھے اور بھانپ چکاتے وقت دکان دار سے خوب بحث و تکرار کرتے تھے۔ ان کی درازئی عمر کا راز سادہ خوراک اور محنت و مشقت میں مضمر تھا۔ حق کے شوقین تھے۔ طالب علموں کے متفہمات کا خندہ پیشانی سے جواب دیتے، لیکن زیادہ سوالوں سے گھبراتے تھے۔ لاہور اور کراچی کے بعض احباب ان کی تنگ مزاجی اور بخل کے افسانے سناتے ہیں، لیکن ان کی حیثیت سنی سنی باتوں سے زیادہ نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ وہ دیرینا آشنا اور جوڑس تھے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے عی نوان طلباء کے لیے لاکھوں روپوں کے عطیات کراچی اور پنجاب کی یونیورسٹیوں کو دیے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کو تین لاکھ روپے عطا کیے اور کم و بیش اتنی رقم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو دی۔ انھوں نے اپنا قیمتی کتب خانہ حیدرآباد یونیورسٹی کو دے دیا۔ جب حدیث کی مشہور کتاب مصنف عبدالرزاق شائع ہوئی تو پچاس ہزار روپے خرچ کر کے اس کے بہت سے نسخے خریدے اور عربی مدارس اور یونیورسٹیوں میں مفت تقسیم کیے۔

راقم السطور پر ان کا بڑا احسان ہے کہ انھوں نے ادب سے ہٹا کر علم حدیث کی طرف متوجہ کیا۔ اس کی اہمیت اور افادیت واضح کی اور ہندوستانی محدثین کی عظمت اور ان کے علمی کارناموں سے متعارف کرایا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس علم کے شیدائی اور اپنے جلیب پاک کی زبان کے خدمت گزار کے درجات بلند کرے اور ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ آمین۔

مجمع البحرین (شیعہ سنی متفق علیہ احادیث): مولانا محمد جعفر شاہ پھلواری

یہ کتاب دہدھ امت کی طرف ایک اہم قدم ہے۔ اس میں وہ احادیث و روایات جمع کی گئی ہیں جو شیعہ و اہل سنت کے درمیان متفق علیہ حیثیت رکھتی ہیں۔ شروع میں علامہ مفتی جعفر حسین مجتہد کا تعارف و تبصرہ اور علامہ نعیر الاجتہادی کی تقریظ ہے۔

قیمت: ۹/- روپے

صفحات ۲۲۲ + ۲۸۱

منے کا پتا rasilaharaid.com